برصغیر کا نوآبادیاتی عہد اور تعلیم نسواں—ایک جائزہ

Shabana Aman Ullah

Abstract: During the Mughal era, women's education was generally limited to the royal and elite classes, with education focused on religious studies, poetry, and basic literacy, while the vast majority of women had no access to formal learning. Women's education in the pre- and post-colonial subcontinent evolved amidst contrasting societal attitudes, shaped by traditional norms, colonial influence, and reformist movements. In the pre-colonial era, education for women was mostly restricted to elite families and limited to religious instruction, with a few Islamic scholars encouraging female education. The British colonial period introduced Western education, which polarized society—conservative groups opposed it, fearing it would disrupt cultural values, while progressive reformers like Molana Altaf Hussain Hali, Moalana Shebli Noumani, and Deputy Nazir Ahmed supported educating women for societal progress. Christian missionary schools also played a role but had limited influence. As a result, post-colonial saw significant female participation in the Tehreek-e-Pakistan, with leaders like Fatima Jinnah and Begum Ra'ana Liaquat Ali Khan mobilizing women for the cause. This marked a shift towards women's public involvement, but society remained divided between traditionalists, who resisted women's education, and more balanced group emerged, promoting women's education within a framework that respected cultural and religious values, fostering institutions that offered both secular and Islamic education. Women's contributions helped reshape the role of women and balance between tradition and modernity continues to influence educational policies and women's empowerment in the region.

* پرنسپل، گورنمنٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین، ظفرالحق روڈ، راولپنڈی

کلیدی الفاظ: نوآبادیات، تعلیم نسواں، تحریک علی گڑھ، انگریزی زبان، سرسید احمد خان، مولوی نذیر احمد، مجالس النساء، مولانا الطاف حسین حالی۔

تعارف اور اہمیت:

برصغیر پاک و ہند وہ خطہ ارض ہے جس کی تاریخ مختلف عقائد، تصورات، روایات، مذاہب، لسان اور معاشرتی اقدار کے عروج و زوال کی عکاسی کرتی ہے۔ آریاؤں کی آمد سے لے کر بیرونی حملہ آوروں کی یلغار، مختلف سماجی پس منظر کی حامل اقوام کا مقام اور حکومت اس کی دلیل ہے۔ اس خطہ ارض میں مغلیہ سلطنت کا آفتاب کئی صدیوں تک پوری آب و تاب کے ساتھ روشن رہا۔ اس آفتاب نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں اپنے زوال کو تسلیم کیا اور کاروبار کرنے کا جھانسہ دے کر آنے والے شاطر ذہنوں کو تقسیم در تقسیم شدہ عوام اور حکمران کو شکست دینے میں زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے مغلیہ سلطنت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور مرؤجہ قوانین، نظام حکومت، معاشرتی ڈھانچے، تہذیبی اقدار کے ساتھ تاریخی شعور پر بھی گہری چوٹ لگائی۔ ماضی کے حملہ آوروں سے قطع نظر انگریز سرکار نے ان تمام کمزور پہلوؤں سے آگاہی حاصل کی اور خود کو برصغیر کی مرؤجہ روایات، نظریات اور معاشرتی اقدار کا حصہ بن کر ایک ہم آہنگی کو فروغ دیا۔ فاتح اور مفتوح کے مابین اس عمل نے ایک نئی ثقافت اور تہذیب کو جنم دیا جہاں مغربی نظریات نے فکری اور معاشرتی رویوں کو بدل کر رکھ دیا۔ اس کے نتیجے میں سماج کا بنیادی ڈھانچہ نئے نئے رنگوں کی عکاسی کرنے لگا۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد کا سماج دو دنیاؤں میں منقسم تھا۔ ایک دنیا نوآباد کار کی قائم شدہ تھی اور دوسری مقامی افراد کی۔ نوآبادیاتی نظام کا خاصا ہے کہ وہ طے شدہ لائحہ عمل اور مقاصد کی تکمیل کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ جس کی بدولت دو دنیاؤں کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ غالب اور فاتح قوم مفتوح اور مغلوب کو اپنے انداز سے ذہنی اور جسمانی غلامی، پرشردگی اور مایوسی میں مبتلا کرتی ہے جہاں انہیں یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ صدیوں سے چلی آرہی ان کی اقدار کم تر ہیں۔

کلیم احسان بٹ نے اپنے ایک مضمون میں اس کی نشان دہی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”اگر تاریخ پر ذرا نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہو گا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل ہی فورٹ ولیم کالج دہلی کالج اور انگریزوں کی سرپرستی یا تعاون سے چلنے والی سوسائٹیوں کے

ذریعے ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہو چکا تھا جسے انگریزی حکومت کی برکات پر پورا یقین تھا اور وہ انگریزوں کے اقبال و سلطنت کے لیے دُعا گو تھا۔“^(۱)

گویا تاجِ برطانیہ آخری ضرب سے پہلے ایک مخصوص طبقے کی ذہن سازی کر چکا تھا جو مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجہ سے انگریز سرکار کو خوش آمدید کہنے کے منتظر تھے۔ ہندوستان پر حکومت کرنے میں استعماری سوچ کار فرما تھی اور عسکری قوت کے ساتھ ساتھ انھوں نے مغربی ثقافت، تہذیب، قوانین، علمی ورثہ، سیاسی نظریات، علوم و فنون، شعر و ادب، الغرض تمام شعبہ ہائے زندگی میں غلام قوم کے فکر اور ذہن پر حاوی کر دیا۔ شکست خوردہ غلام قوم کی مایوسی کو بنیاد بنا کر استعماری نظام نے ذہنوں کو مغلوب کیا اور اپنی برتری کی دھاک بٹھادی اور پھر معاشرے میں قابض قوم کے نقطہ نظر اور زاویہ نگاہ سے اپنی تہذیب و معاشرت کو پرکھنے کے اصول نافذ کر دیے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ فاتح کی حکمرانی کا عروج مقامی باشندوں کے فکر و نظر اور ذہن کے زوال کی بدولت ہوتا ہے۔ غلام قوم کو ان کی اپنی سوچ، روایات اور سماجی ڈھانچے کو مسمار کر کے اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر روش ندیم اپنے مضمون ”ہندوستان اور یورپ میں نوآبادیات کا تاریخی پس منظر“ میں رقم طراز ہیں:

”بعد ازاں انگلستان سب سے پہلے اپنے ہاں کے جاگیر دارانہ نظام کو مٹانے اور ہندوستانی دست کار صنعت تباہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لہذا اس نے اپنی نئی قوتوں کے ذریعے ہندوستان میں پُرنگالی، فرانسیسی، ولندیزی، ہسپانوی اقوام کو شکست دے کر نوآبادیات قائم کرنے کے لیے راہیں صاف کر لیں جس سے ہندوستان کی تاریخ کا پانسابلٹ گیا اور پاک و ہند ایک طویل نوآبادیاتی غلامی کے شکنجے میں جکڑ گیا۔“^(۲)

ہندوستانی معاشرے کو تقسیم کر کے برطانوی حکومت نے مرّوجہ قوانین اور اصولوں کو رد کیا اور خود تری

کے علاوہ ذہنی احساس کمتری کو بھی دوچند کر دیا۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

”نوآبادیاتی دنیا کی دو میں تقسیم کا اختیار نوآباد کار کے پاس ہوتا ہے۔ نوآباد کار محض اس تقسیم کے ذریعے اپنے اختیار کا مظاہرہ ہی نہیں کرتا، اس تقسیم کے نتیجے میں اپنے اختیار کو بڑھاتا بھی ہے۔ یہ تقسیم بہ یک وقت طبعی اور ذہنی ہوتی ہے۔ نوآباد کار اپنی اقامت گاہوں، چھاؤنیوں، دفاتر کو مقامی باشندوں سے الگ رکھتا ہے اور مقامیوں کو ان کے

قریب پھٹکنے کی سختی سے ممانعت ہوتی ہے۔ ”کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے“
کی سختی جگہ جگہ آویزاں ہوتی ہے۔“ (۳)

اُنیسویں صدی کے دروان میں یورپ اور مغربی دنیا سائنسی تحقیقات کی بدولت علم و فنون اور تجارت کو فروغ دے رہی تھی۔ مگر مسلمان ایک درخشندہ ماضی کے وارث اپنے اختلافات، تعصبات اور عدم اتحاد کے نتیجے میں غلامی کا شکار ہو رہے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ اس کی مثال ہے۔ ہندوستان میں برطانوی سامراج نے آخری مغل بادشاہ کو شکستِ فاش دے کر استحصال کے لیے پولیس اور عدالتی نظام کو بطور ہتھیار استعمال کر کے اپنی سوچ کے مطابق برصغیر کے معاشرے کی مجموعی اساس کو بدل دیا۔ ’تقسیم کرو اور حکمرانی کرو‘ کے اصول کی پیروی کرتے ہوئے باہمی نفاق کو فروغ دے کر انتہا پسندانہ رویوں کو جنم دیا۔ نوآبادیاتی دور میں قابض سامراج نے ہندوستان کے بنیادی تشخص کو مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ ان انتہا پسندانہ رویوں کی عکاسی کرتا ہوا معاشرہ دو طبقات میں بٹ گیا۔ پہلا طبقہ اپنے معاشرے کی ہر شے کو حقیر سمجھ کر مغربی تہذیب سے مرعوب ہوا جب کہ دوسرا طبقہ اپنی روایات اور اقدار کو حرفِ آخر سمجھ کر سینے سے لگا بیٹھا۔

نوآبادیاتی عہد میں جب مغربی نظریات فروغ پانے لگے تو عالمی تحریکوں کے اثرات بھی یہاں تک پہنچے۔ شعر و ادب کے مروجہ پیمانے مغربی تنقیدی نظریات کی روشنی میں بدلنے لگے۔ اسی دوران میں مغرب میں حقوق نسواں کی علمبردار تحریک جیسے تائیدی تحریک یا فیمنزم کے نظریات نے برصغیر کی خواتین بالخصوص مسلمان خواتین کو متاثر کیا۔ فیمنزم کی تحریک خواتین کے بحیثیت انسان حقوق کی داعی تھی۔ اس کے بنیادی نظریات میں سے ایک اہم نظریہ خواتین کو تعلیم حاصل کرنے کا حق دلوانا بھی تھا۔ ان مغربی نظریات نے برصغیر میں جگہ بنا کر حقوق نسواں کی تحریک کی آبیاری کی۔

انگریز سرکار کے معاندانہ رویوں اور مسلم کش پالیسیوں کے نتیجے میں چند قوم کے ہمدرد میدان عمل میں اترے۔ ان میں نمایاں شخصیت سر سید احمد خان کی تھی جو مسلمانوں کے حقوق کے حصول اور فروغِ تعلیم کے ضمن میں متحرک دکھائی دیے۔ وہ جدید علوم اور انگریزی زبان کے فروغ کے لیے ایک بڑی تحریک کا نقطہ آغاز ثابت ہوئے۔ میاں ساجد علی اپنے مضمون ”تعلیم نسواں: فکرِ اقبال اور خیالات اکبر کی روشنی میں“ میں لکھتے ہیں:

”سر سید تحریک کے زیر اثر نہ صرف مردوں کی تعلیم عام ہوئی بلکہ عورتیں بھی اس طرف متوجہ ہونے لگیں۔ چنانچہ سر سید اور ان کے رفقاء نے ہندوستانی عورت کی جہالت دور کرنے پر بہت زور دیا اور تعلیم نسواں کے لیے ایک باقاعدہ تحریک چلائی گئی۔ چنانچہ

مولوی نذیر احمد نے ناول بھی لکھے جن میں انہیں علم حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی۔“ (۴)

تحریکِ علی گڑھ ایک مقصدی اور اصلاحی تحریک تھی جس کا مقصد عوام بالخصوص مسلمانوں کو جدید تعلیم اور انگریزی زبان کے حصول کے لیے تیار کرنا تھا۔ سر سید احمد خان سرخیل علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو سیاست سے دُور رہنے اور حصولِ علم اور معاشرتی اصلاح پر زور دیا مگر تعلیم نسواں کے حوالے سے سر سید احمد خان اور ان کے رفقا میں مختلف زاویہ ہائے نگاہ دکھائی دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس تحریک سے ہٹ کر بھی مختلف فکری حلقوں میں جدید تعلیم اور روایتی تعلیم کے حوالے سے کئی تحفظات پائے جاتے تھے۔ برصغیر کے روایتی نظامِ تعلیم کے بارے میں پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

”برصغیر میں مسلمان طبقے میں تعلیم حاصل کرنے کے تین طریقے رائج تھے جن میں مساجد، مدارس اور گھروں پر تعلیم دی جاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم کا ذریعہ گھر تھے۔ بنیادی حیثیت دینی تعلیم کو حاصل تھی۔ اس کے ساتھ کتابت، خطاطی، فنونِ سپہ گری، فنِ تعمیر، فنِ کوزہ گری کی تعلیم کا رواج تھا۔“ (۵)

یہ نظامِ تعلیم مسلمان حکمرانوں کے عہد میں تھا۔ حکمران فروغِ تعلیم کے لیے خصوصی اقدامات کرتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱-۱۲۸۸) سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر تک سب مسلمان حکمرانوں نے تعلیمی وظائف مقرر کیے۔ لا تعداد اسکول اور کالج قائم کیے۔ شعبہ تدریس سے وابستہ افراد کو مالی طور پر خوش حال کیا۔ مسلمان لڑکیوں کو پردے کی وجہ سے گھر پر تربیت یافتہ معلمات کے ذریعے تعلیم دی جاتی۔ مغلیہ خاندان کی خواتین خود بھی تعلیم یافتہ تھیں اور فروغِ علم یعنی تعلیم نسواں کی علمبردار تھیں۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے دلی کالج کا قیام عمل میں لایا گیا مگر فسادات کی وجہ سے اسے بند کر دیا گیا۔ دوبارہ عمل تدریس نئے نصاب، تعلیمی پالیسی اور ذریعہ تعلیم کی تبدیلی کے ساتھ شروع کیا گیا۔ اس کالج سے تحصیل یافتہ اشخاص میں مولوی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ اور ڈاکٹر ضیاء الدین تھے جنہوں نے علی گڑھ تحریک کا حصہ بن کر ”تعلیم نسواں کی حمایت کی اور علمی سطح پر بھی کئی کاوشیں کیں۔“

انگریز سرکار کو حکومتی امور کی انجام دہی کے لیے تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت تھی۔ لہذا انہوں نے برصغیر کے عوام کو ”تعلیم برائے روزگار“ کے تاثر سے آگاہی دی۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مختلف جگہوں پر اسکول اور کالج کھولے گئے۔ ان میں سنسکرت کالج اور فورٹ ولیم کالج قابل ذکر ہیں۔ انگریزوں نے مسلمانوں سے معاندانہ

رویہ رکھا۔ تعلیم اور ملازمتوں کے دروازے اُن پر بند کر دیے۔ ان حالات میں مسلمان مرد اور خواتین حصولِ علم سے دُور ہوئے۔ اس صورتِ حال نے استعماری اور سامراجی نظام کو مسلمانوں کے روایتی نظریہ تعلیم پر ضرب کاری لگانے کا بھرپور موقعہ دیا۔ انگریزی زبان کی تعلیم کے علاوہ اپنی مرضی کے مقاصدِ تعلیم اور نصاب کی ترویج کی۔ ہندوستانی مسلمان اور معاشرہ انگریزی تعلیم اور تعلیمی اداروں کے بارے میں منفی رویہ رکھتا تھا لہذا تعلیم نسواں جو پہلے کسی نہ کسی صورتِ حال میں جاری تھی اس عمل کے نتیجے میں مکمل ختم ہو گئی۔ انگریز سامراج کی سرپرستی میں قائم کردہ جامعات جن کا قیام کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں لایا گیا تھا، اپنے مخصوص ایجنڈے کے حصول میں کامیاب دکھائی دینے لگیں۔ رفتہ رفتہ اس نظامِ تعلیم نے تحصیلِ علم کو اپنے تابع کر لیا اور خواتین کی تعلیم کے لیے کلکتہ، بمبئی، گجرات، مدراس، احمد آباد، پونا و لکھنؤ اور بنگلور میں جا بجا اسکول اور کالج کھولے گئے۔ برصغیر کے عوام مذہب کی فوقیت کے قائل تھے۔ لہذا اس مذہبی لگاؤ کے نتیجے میں خواتین ان اداروں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نہ تھیں۔ اپنی روایات، مذہب، اخلاق اور ماحول کے مطابق نصاب اور جدید علوم سے متصل ایک نئے نظامِ تعلیم کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ پٹنہ میں حکیم سید احمد حسین صوفی نے بارش کے پہلے قطرے کی طرح لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کر کے نیا نصاب ترتیب دیا۔ اس عمل نے دیگر اہل فکر و دانش کو بھی متحرک کیا اور بنگال میں سینٹرل مجنر ایسوسی ایشن، بمبئی میں انجمن اسلام، لاہور میں انجمن حمایتِ اسلام اور یو۔ پی میں تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لیے کئی اقدام کیے گئے۔

سید الطاف علی بریلوی مسلمانوں کے زوال کا تجزیہ کرتے ہوئے سرسید کی رائے کو ان الفاظ میں پیش

کرتے ہیں:

”میں نے سوچا قوم پر مصیبت کیوں پڑی ہے اور کیوں کر دُور ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب ملا

کہ قوم میں تعلیم و تربیت نہ تھی۔“ (۲)

سرسید کی یہی سوچ تحریکِ علی گڑھ کا نکتہ آغاز تھی۔ سرسید احمد خان مسلمانوں کو زوال سے نکالنے کی جدوجہد میں ایک ایسے نظامِ تعلیم کے علمبردار کہلائے جو مسلمانوں کے تشخص کو مسخ کیے بغیر انہیں جدید تعلیم سے آراستہ کرے۔ انھوں نے علی گڑھ اسکول اور کالج کا قیام کر کے مسلمانوں پر تعلیم کے بند دروازے کھولے۔ یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ سرسید جدید تعلیم کے معاملے میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں یا عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے حق میں نہ تھے۔ اُن کے خیال کے مطابق پہلے مسلمان مرد تعلیم حاصل کریں اور پھر عورتوں کو تعلیم دی جائے۔ سرسید کے اس نظریے میں خواتین کی تعلیم کے لیے کوئی خاص جوش و خروش نظر نہیں آتا۔ اُن کا کہنا کہ پہلے

مردوں کو تعلیم دی جائے بعد میں عورتوں کو، بذاتِ خود تضاد کی عکاسی کرتا ہے۔ مردوں پر جدید تعلیم حاصل کرنے کو لازم کرنا اور خواتین کی تعلیم کو مؤخر کرنا واضح طور پر خواتین کو بحیثیتِ انسان اُن کے بنیادی حق سے محروم کرنا تھا۔ ”مضامین سر سید“ میں شامل ایک مضمون میں وہ تعلیم نسواں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”جو لوگ کہ ان خرابیوں کو مذہبِ اسلام کی طرف نسبت کرتے ہیں یقیناً ان کی غلطی ہے بلکہ ہندوستان میں جس قدر کہ عورتوں کی حالت میں تنزل ہے صرف اس کا باعث احکامِ مذہبِ اسلام عورتوں کی بخوبی پابندی نہ کرنا ہے۔ اگر ان کی پابندی کی جاوے تو بلا شبہ یہ تمام خرابیاں دُور ہو سکتی ہیں۔“ (۷)

اس مضمون میں وہ ہندوستان میں خواتین کے حقوق کی عدم ادائیگی کی بات تو کرتے ہیں مگر تمام خرابیوں کا ملبہ مردوں پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ مذہب پر عمل نہیں کرتے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عورت کی ثانوی حیثیت کے قائل تھے۔ سر سید اپنے ایک خط میں جو انھوں نے سید ممتاز علی کے نام لکھا ہے، ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

”میری آرزو ہے کہ عورتوں کو اعلیٰ تعلیم دی جائے مگر موجودہ حالت میں کنواری عورتوں کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا اور ان کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے..... عورت کی تعلیم قبل مہذب ہونے مردوں کے لیے ناموزوں تو عورتوں کے لیے آفت بے درماں ہے۔“ (۸)

سر سید اپنے دوسرے مضمون میں بعنوان ”قومی تعلیم، قومی ہمدردی اور باہمی اتفاق“ میں قوم کے متعلق اپنے نظریات پیش کرتے ہیں مگر اس میں بھی ساری تفصیل کا مٹج نظر مردوں کی قومی تعلیم ہے۔ خواتین کی قومی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

مگر مجھے اس بات کے دیکھنے سے افسوس ہے کہ ہم سب آپس میں بھائی تو ہیں مگر مثل برادرانِ یوسف علیہ السلام کے ہیں۔ آپس میں دوستی و محبت یک دلی و یکجہتی بہت کم ہے۔ حسد و بغض کا ہر جگہ براثر پایا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ آپس کی نااتفاقی ہے۔“ (۹)

سر سید کے مطابق خواتین کو جدید علوم یا زبان کی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ اُن کے مطابق خواتین کو وہی مقدس کتابیں پڑھنی چاہیے جو ان کی نانیاں یادادیاں پڑھتی آئی ہیں۔ زمانے کی نامرؤجہ اور نامبارک کتب اُن کے لیے موزوں نہیں تھیں۔

سر سید کی تحریک سے وابستہ دیگر اکابرین کی تعلیم نسواں کے حوالے سے الگ سوچ تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا شبلی نعمانی، مولوی ممتاز علی، اور کئی اکابرین تعلیم نسواں کے فروغ کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ”مرآة العروس“ اور ”بنات النعش“ میں خواتین کی تعلیم اور حقوق پر قلم فرسائی کی۔ الطاف حسین حالی نے ”مجالس النساء“ کے عنوان سے خواتین کو درپیش مسائل اور ان کی تعلیم و تربیت کی پرزور حمایت کی۔ انھوں نے اپنی نظموں ”مناجات بیوہ“، ”چپ کی داد“ اور بیٹیوں کی نسبت میں خواتین کے استحصال اور ان پر ہونے والی زیادتیوں کو واضح کیا۔ عملی سطح پر نواب سلطان جہاں بیگم کی تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں کا ساتھ دیا اور اصنافِ نظم و نثر کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا گیا۔

مولانا حالی ذاتی طور پر خواتین کے حقوق پامال ہونے پر رنجیدہ تھے۔ وہ مردوں کو قائل کرنا چاہتے تھے کہ وہ خواتین کو علم حاصل کرنے دیں۔ ڈاکٹر سمیع اختران نظریات کو اپنے مضمون ”تعلیم نسواں کا نقیب حالی“ میں پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”مولانا حالی کی اجتماعی شاعری کا ایک اہم عنصر ہندوستانی معاشرے میں از روئے انسانیت اور از روئے شریعت عورتوں کے جائز دینی، انسانی اور معاشرتی حقوق کی بازیابی کے لیے عملی جدوجہد ہے۔ مولانا حالی ہندوستانی معاشرے میں عورتوں پر ہونے والے مظالم اور زیادتیوں سے بے حد کبیدہ خاطر تھے۔“ (۱۰)

مولانا حالی کے علاوہ مولانا شبلی نعمانی بھی تعلیم نسواں کے فروغ میں کوشاں تھے۔ مولانا شبلی کے خطوط کے مطالعے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے قائل تھے اور وہ خواتین کے الگ نصاب کی تجویز پر معترض تھے۔ وہ بیگم عطیہ فیضی کے نام خطوط میں خواتین کی تعلیم کے لیے تحریک چلانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ بیگم عطیہ فیضی کے علاوہ انھوں نے اپنے دیگر احباب کو بھی اس مقصد کی تکمیل کے لیے خطوط لکھے۔ مولانا حبیب الرحمان شروانی کے نام ایک خط میں وہ تحریر کرتے ہیں:

”بہی میں عورتوں کے حلے دیکھے۔ ان کی تقریریں سُنیں، ان کی قابلیت دیکھی لیکن چنداں خوشی نہ ہوئی کیونکہ ان کی سرگرمیوں میں مسلمان عورتوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔“ (۱۱)

مولانا شبلی خواتین خصوصاً مسلم خواتین کی ایسی تعلیم کے خواہاں تھے جو زمانہ سازی، مشکل خوشی، اور حوصلہ مندی کی ترجمان ہو۔ وہ سر سید اور دیگر اکابرین کی بہ نسبت مرد و عورت دونوں کے لیے یکساں تعلیم اور

نصاب کو لازمی قرار دیتے ہیں اور اس کو دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے تاکہ مرد عورت کو کم تر نہ سمجھیں۔ مولانا شبلی کے بارے میں ڈاکٹر راج بہادر رقم طراز ہیں:

”شبلی عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے اور وہ بھی عصری یہ نہیں کہ انہیں امور خانہ داری ہی میں محصور رکھا جائے لیکن لگتا ہے کہ کوئی انہیں پیچھے سے کھینچتا ہے۔“ (۱۲)

مولانا شبلی تعلیم نسواں کے ساتھ ساتھ حقوق نسواں کے بھی قائل تھے۔ وہ خاتون کو دھان پان یا چھوٹی موٹی کی بجائے جمال اور جلال کا پیکر بنانے کے خواہ تھے۔

حقوق نسواں کے لیے بالعموم اور تعلیم نسواں کے لیے بالخصوص بلند ہونے والی آوازیں اب یکجا ہو کر جدوجہد کے لیے تیار تھیں۔ قلمی اور عملی دونوں اعتبار سے یہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھیں۔

ایجوکیشنل کانفرس کے سالانہ جلسے میں شعبہ تعلیم نسواں کا قیام عمل میں آیا۔ مولوی ممتاز علی اس کے پہلے سیکریٹری بنے۔ مولوی ممتاز کو خواتین کے لیے رسالہ جاری کرنے پر سرسید کی طرف سے سرزنش کا سامنا کرنا پڑا۔ اور پھر سرسید کی وفات کے بعد انہوں نے خواتین کے لیے رسالہ جاری کیا۔ ان کے بعد شیخ محمد عبداللہ کانفرنس کے سیکریٹری بنے اور مولانا حالی کی مشاورت کے نتیجے میں ایم اے او کالج کا ”رسالہ علی گڑھ منقلی“ نومبر ۱۹۰۳ء کا شمارہ بعنوان ”ہم اور ہماری خواتین“ سے منسوب کیا گیا۔ اس کے علاوہ ”تہذیب نسواں“ کے اجرا کے لیے ماحول سازگار ہوا جس میں تعلیم نسواں کے علاوہ خواتین کے دیگر حقوق اور درپیش مسائل پیش کیے گئے۔ مغرب میں نسائی تحریک کے پھیلنے کے بعد برصغیر بھی اس کے زیر اثر آ گیا۔ تنویر انجم بھٹی کے مضمون ”نسائی تحریک کے ارتقاء“ میں انگریزوں کے عہد سے نسائی شعور کے پہلے مرحلے کا ذکر ملتا ہے۔ وہ نسائیت کو اصلاحی، روشن خیالی، ترقی پسند اور انقلابی قرار دیتے ہیں۔ یہ نسائی شعور تعلیم نسواں کے بغیر ممکن نہ تھا۔ لہذا خواتین کی تعلیم کے لیے کئی ادب بھی میدان میں آ گئے۔ ان میں علامہ راشد الخیری ایک مضبوط اور زور آور شخصیت تھے جنہوں نے ”نوحہ زندگی“، ”صبح زندگی“ جیسے فن پارے تخلیق کیے۔ سجاد حیدر یلدرم کے تحریر شدہ نثری فن پارے، ڈاکٹر رشید جہاں کا افسانہ ”دلی کی سیر“ محمدی بیگم کا جاری کردہ مشہور رسالہ تہذیب نسواں علی گڑھ سے شیخ عبداللہ اور بیگم عبداللہ کا ماہنامہ ”خاتون“ (۱۹۰۶ء) خواتین کے نسائی شعور کی ترویج کی توانا آواز بن کر ابھرے۔ ۱۹۰۸ء میں علامہ راشد الخیری نے ماہنامہ ”عصمت“ کا آغاز کیا اور خواتین کے فرضی ناموں سے لکھا۔ ماہنامہ عصمت کے مدیر شیخ محمد اکرم اور نائب مدیرہ جوآن کی بیگم تھیں مل کر خواتین کو علم کے حصول کے راستے پر چلنے کی رغبت دلائی۔ علاوہ ازیں تربیت اور علمی وادبی صلاحیتیں اُجاگر کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھنؤ سے ”پردہ عصمت“ جاری کر کے تعلیم نسواں کی بھرپور حمایت کی اور سخت مخالفت کے باوجود اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ لاہور اور امرتسر سے شائع ہونے والا رسالہ ”سہیلی“ خواتین کے پردے اور تعلیم کے حوالے سے مباحث پیش کرتا تھا۔ نوآبادیاتی عہد میں بقول ڈاکٹر جمیل اختر بحوالہ ”اُردو میں جراند نسواں کی تاریخ“ میں آزادی سے قبل خواتین کے ایک سو جراند اور رسالوں کا اجرا ہوتا تھا جن میں حصولِ علم، حقوقِ نسواں کے علاوہ خواتین کی تعلیم سے متعلقہ مواد بھی شامل ہوتا تھا۔ یہ طرزِ عمل اور اندازِ فکر مولانا اشرف تھانوی کی سوچ رکھنے والے مکتبہ فکر کو رد کرتا تھا جس کے مطابق عورت کو تعلیم دلوانے سے وہ عشقیہ خطوط لکھے گی یا اُسے اتنی تعلیم دی جائے کہ وہ دھوبی کا حساب رکھ سکے۔ انہوں نے ”بہشتی زیور“ لکھ کر خواتین کی اعلیٰ تعلیم کی شدید مخالفت کی۔ بالخصوص میم استاد سے تعلیم حاصل کرنا ممنوع قرار دیا۔ اس منفی سوچ کی حوصلہ شکنی کرنے میں تہذیبِ نسواں کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی تقاریر پر مشتمل مضامین ہوتے تھے۔ محمدی بیگم کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے لکھی گئی کتابیں ان کے قلمی جہاد کی عکاس ہیں۔ ان تمام کاوشوں نے خواتین کو بحیثیت انسان ماننے میں اہم کردار ادا کیا۔ ماہنامہ ”خاتون“ میں خواتین کے تعلیمی مسائل نصابِ انگریزی پڑھانے کے فوائد اور نقصانات کی پیش کش کے علاوہ بہتر نصابی کتب کی ضرورت پر بھی زور دیا جاتا تھا۔ نوآبادیاتی عہد میں برصغیر میں تعلیم نسواں کے اعتبار سے واضح تقسیم نظر آتی ہے۔ ایک طبقہ خواتین کے پردے کو بنیاد بنا کر گھر سے باہر نکلنے کی پابندی کی وجہ سے تعلیم سے محروم رکھنا چاہتا ہے، دوسرا طبقہ انگریز سرکار کی حمایت یافتہ تعلیمی اداروں میں انگریزی زبان میں جدید علوم سیکھنے کو وقت کی ضرورت قرار دیتا ہے۔ اس طبقے کی ذہنی، غلامی اور مغربی تہذیب، زبان و ادب سے مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ اُسے اپنا تمام تخلیقی سرمایہ، روایات، تہذیب و تمدن اور معاشرتی اقدار فرسودہ دکھائی دیتے تھے۔ چونکہ استعماری نظام اپنی بقاء اور حصولِ مقاصد کے لیے مقامی افراد کی ہر اُس شے کو جس کی جڑیں برصغیر کی مٹی میں پیوست تھیں، برباد کرنے پر تھلا ہوا تھا اس لیے زندگی کا کوئی شعبہ اس کی دست برد سے خالی نہ تھا۔ حتیٰ کہ اصنافِ ادب میں غزل کو ناپسندیدہ قرار دے کر مغرب کی نظم آزاد اور معری کو شعوری طور پر فروغ دینے کی کوششیں انگریز سرکار کی پشت پناہی کی وجہ سے توانا ہونے لگیں۔ ان دو طبقات کے علاوہ تیسرا طبقہ وہ تھا جو اپنی تہذیب و تمدن، ثقافت اور پہچان کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تقاضوں سے ہم آہنگی چاہتا تھا۔ اس طبقے کا انداز میانہ روی کا عکاس تھا اور عمل غیر انتہا پسندانہ تھا جو مرد و عورتوں کے ساتھ نئے رجحانات کے اثرات کو قبول کرنے کا داعی تھا۔ مغربی تحریکوں اور انگریزی زبان و ادب کو جاننے کا خواہشمند طبقہ اپنی زمین پر مضبوطی سے پاؤں کو گاڑے مشرق و مغرب کے اسرار و رموز سمجھنے کی کوشش میں تھا۔ ”تعلیم نسواں“ کی مخالفت میں وہ خواتین بھی پیش پیش تھیں

جن کی سوچ کے مطابق عورت کو صرف دینی تعلیم دینا ہی کافی تھا اور خاتون کا کردار محض تربیتِ اولاد اور گھریلو کام کا ج تک محدود تھا۔ اکثر تعلیم نسواں کا مخالف طبقہ پردے کی پابندی کو بطور جواز پیش کرتا تھا لیکن تعلیم نسواں کا حمایتی مکتبہ فکر اس قدر غن کو محض ایک بہانہ قرار دے کر اسے خواتین کو شعور دینے والے ہر راستے کی مخالفت قرار دیتا تھا۔ اس طرز فکر کی عمدہ مثال مولوی محب حسین کا رسالہ ”معلم نسواں“ تھا۔ مولوی صاحب سخت اور غیر شرعی پردے کے ناقد تھے اور خواتین کی تعلیم کو کلیدی حیثیت دیتے تھے۔ انہوں نے ایسے پردے کو جو خواتین کو ان کے بنیادی حقوق سے دور رکھے، ”عس دوام“ کا نام دیتے تھے۔ ان کی اتنی شدید مخالفت کی گئی کہ بالآخر انہیں یہ رسالہ بند کرنا پڑا۔ لیکن برصغیر میں پھیلی چار سو حقوق نسواں اور تعلیم نسواں کے حصول کی آوازیں اتنی توانا تھیں کہ انہیں دبانانا ممکن نظر آتا تھا۔ حتیٰ کہ اردو شاعری کی سب سے پر زور آواز اکبر الہ آبادی کی تعلیم نسواں کی مخالفت بھی اسی جدوجہد کو ختم نہ کر سکی۔ اکبر الہ آبادی سرسید کے طرز فکر اور نظریہ تعلیم کے شدید مخالف تھے۔ اپنے طنز و مزاح کے تیروں سے لیس کلام کو مغربی تہذیب، انگریزی زبان اور تعلیمی نظریات پر وار کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ وہ نوکری انگریز سرکار کی کرتے تھے مگر شاعری میں ان کی تہذیب، نظریات، زبان اور تعلیم کے مخالف تھے۔ ڈاکٹر انور محمود خالد اپنے مضمون ”تعلیم نسواں“ میں لکھتے ہیں:

”نہ جانے اکبر الہ آبادی کو کیا سوچھی کہ عورتوں کی تعلیم کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے۔ فرماتے ہیں کہ ’تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر خاتون خانہ ہو سبھا کی پری نہ ہوں۔‘ بھئی! اگر خواتین اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد خاتون خانہ کے فرائض بھی بخوبی سرانجام دیں اور کبھی کبھار سبھا کی پری بن کر تصویر کائنات میں بھی رنگ بھریں تو آپ کو اعتراض کیوں ہو؟ ایک طرف تو آپ مرد اور عورت کو، زندگی کی گاڑی کے دو پیسے قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف یہ چاہتے ہیں کہ ایک پہیہ تو گھر کے باہر دن رات چلتا رہے اور دوسرا پہیہ صرف گھر کی چار دیواری کے اندر گردش کرتا رہے۔ بھلا کہاں کا انصاف ہے؟ کیا زندگی کا توازن اس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ ہر گز نہیں!“ (۱۳)

اکبر الہ آبادی جدید تعلیم کے فروغ میں سرسید کو تنقید کا نشانہ بناتے رہے اور مغربی تہذیب کو رد کرتے رہے مگر بالآخر انہیں ہارمانی پڑی اور انہوں نے سرسید کی علمی کوششوں کا اعتراف کر لیا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، اکبر الہ آبادی کی شاعری کے متعلق اپنے رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”اکبر کی شاعری کے کمال عروج و شہرت کا زمانہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی ہے لیکن ان کی اصلاحی شاعری کی بنیاد انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں پڑ چکی تھی۔ ہندوستان خصوصاً مسلمانانِ ہند میں عین یہی زمانہ مغربی تمدن، مغربی معاشرت، مغربی علوم، غرض مغربیت کے ہر شعبے کی انتہائی عروج و مقبولی و فروغ کا ہے۔“ (۱۳)

اس عہد کی نمایاں شخصیت ڈاکٹر علامہ اقبال تھے جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خواتین کی تعلیم کے حوالے سے وہ ایک مخصوص نظریہ رکھتے تھے۔ تعلیم نسواں کے حوالے سے محمد احمد خاں نے اپنی کتاب ”اقبال اور مسئلہ تعلیم“ میں باب نمبر ۱۰ میں علامہ اقبال کے ان الفاظ میں نظریات پیش کیے ہیں۔ علامہ اقبال مغربی تصورِ نسواں سے نالاں سے دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال مرد و عورت کی ماڈی حیثیت کی بحث کو درست قرار نہیں دیتے۔ اُن کے مطابق عورت کو بقائے نسل اور تشکیلِ معاشرہ تک وقف ہونا چاہیے زن اور نازن کی بحث پیش کرتے ہیں۔ سیکولر تعلیم کو خواتین کے لیے زہرِ ہلاہل قرار دیتے ہیں۔ اقبال جدید مغربی تعلیم کو من و عن قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ محمد احمد خاں لکھتے ہیں:

”دوسرے لفظوں میں عورت کی سیکولر تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایسے ادارے Institution کو دین سے بیگانہ و بے بہرہ کر دیا جائے، جو افراد، خاندان، معاشرہ اور قوم کی تعمیر بھی کر سکتا ہے اور تخریب بھی۔ لیکن جب یہ ادارہ خود فکری لحاظ سے ”دین“ سے بیگانہ ہو جائے گا تو اس سے تخریب کا عمل ہی جاری رہے گا کہ وہ ایک ”فکری قوم“ کی جس کی بنیاد و اساس ہی ”دین“ ہے تعمیر نہیں کر سکے گا۔ یہ ادارہ نقطہ کشش و اجتماع نہیں مرکز انتشار و انتشار بن جائے گا، اسی لیے اقبال اس ادارہ ”مدرسہ زن“ کے بیگانہ دین ہو جانے کو ”عشق و محبت کی موت قرار دیتے ہیں کہ عشق و محبت ہی مسلمان جیسی فکری قوم کی شیرازہ بند ہے۔“ (۱۵)

اقبال کے تصورِ نسواں اور تعلیمِ نسواں سے متعلق نظریات سے اختلاف کرنا شاید درست نہ ہو لیکن اقبال جس معاشرے اور جس دین کے نظام اور جس فکری قوم کی بات کر رہے وہ نوآبادیاتی عہد میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اکثر مسلمان اکابرین تعلیم کے حصول کی حمایت کرتے دکھائی دیتے ہیں مگر جب تعلیمِ نسواں اور حقوقِ نسواں کی بات ہو تو اُن کی روشن خیالی قدامت پسندی میں بدل جاتی ہے۔

جس آئیڈیل قوم اور معاشرے کی خاتون کے لیے اقبال جو تصورِ تعلیم پیش کر رہے ہیں، اُس کا حقیقت میں وجود عنقا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان کے لیے شریعت کے مطابق زندگی گزارنا اور اسلامی اصولوں کی پیروی کرنا لازمی ہے مگر اجتہاد کے قائل علامہ اقبال تعلیم نسواں کے معاملے میں اُن ہی نظریات کے ہم نوا ہیں جو مدرسے میں خواتین کی تعلیم کے محدود ہونے کو سراہتے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں وہ مدرسہ خواتین کے لیے حقیقی طور پر موجود ہے جس میں تصورِ اقبال کے مطابق تعلیم کی سہولت میسر ہو؟ اگر اس کا جواب انکار یا نفی کی صورت میں ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے وہ معاشرہ اور تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جس کی شبیہ ہمیں اقبال کے تصورِ نسواں اور تعلیم نسواں سے اخذ کرتی ہے۔ جب تک ایسے ادارے قائم نہ ہوں گے تو کیا عورت پر تعلیم کے دروازے بند کر دینے چاہئیں؟ اگر کوئی خاتون ڈاکٹر، نرس یا وکیل بننا چاہتی ہے تو اُس کو دینی نصاب کو پڑھنا ہوگا؟ مذہب یا دین انسان کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اور نظامِ تعلیم مرد و زن کو معاشرے کا کارآمد شہری بناتا ہے۔ تعلیم نسواں کے معاملے میں پردہ حائل کر کے اُس کے راستے مسدود کرنا اور کبھی ”دین“ کی ہم آہنگی سے دی جانے والی تعلیم کو جواز بنا کر خواتین کے بنیادی حقوق کا استحصال کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ اور اگر معاشرے میں مرد کا حکمرانہ انداز کا کردار ہے تو پھر اس معاشرے میں بگاڑ پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا معاشرہ ترقی یافتہ کہلانا چاہیے لیکن اقبال کا عہد نوآبادیاتی نظام میں جکڑا ہوا اور آزادی کے حصول کی جدوجہد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جہاں مسلمانوں کو تعلیم سے دُور رکھا جاتا تھا۔ اُن پر اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے بند تھے۔ شعوری طور پر قابض حکمران اُس کے کاروبار کو برباد کرنے پر تلے تھے۔

ان وجوہات کی بنا پر خواتین کی تعلیم کو مختلف پابندیوں پر جکڑنا مسلمان قوم کی بد حالی کو بڑھانے کے مترادف ہے۔ اقبال اپنے نظریات میں مشہور سائنسدان الکسز کیرل کے حامی نظر آتے ہیں۔

”جو ذہنی و جسمانی تربیت لڑکوں کو دی جاتی ہے، وہی لڑکیوں کو نہیں دی جانی چاہیے۔ جو اُمنگیں (Ambitions) لڑکوں میں اُبھاری جاتی ہیں وہ لڑکیوں میں نہیں اُبھارنی چاہئیں۔ ماہرینِ تعلیم کو چاہیے کہ عورت و مرد کے ذہنی و نامیاتی (Organic) خصوصیات (Pecularity) اور ان کے فطری فرائض (Natural Functions) پر گہری توجہ دیں۔ ان دونوں اصناف میں ناقابلِ تنسیخ، امنٹ اختلافات ہیں۔ مہذب دنیا کی تعمیر میں ان اختلافات کو پیش نظر رکھنا قطعاً لازمی ہے۔“ (۱۶)

الکسر کیرل کی رائے سے اختلاف ممکن ہے کیوں کہ کئی شعبہ ہائے زندگی ایسے ہیں جہاں تعلیم یافتہ خواتین کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔ مثلاً اگر خواتین ڈاکٹر، استاد، وکیل، نرس جیسے شعبوں میں اپنا کردار ادا نہیں کریں گی تو معاشرے کی خواتین پر مشتمل آبادی کی امدادوں سے اپنے معاملات حل کروائیں گی۔

علاوہ ازیں جس الگ تعلیمی نصاب کو تشکیل دینے کی بات علامہ اقبال نے کی ہے وہ نصاب اُن کی زندگی کے اختتام تک کبھی ترتیب ہی نہیں دیا گیا۔ علامہ اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں تقریر کے دوران اپنا تصورِ تعلیم نسواں پیش کیا۔ جس کے مطابق خواتین کو ابتدائی تعلیم خالصتاً مذہبی نوعیت کی دی جائے، اُس کے بعد اسلامی تاریخ، علم، تدبیر خانہ داری، اصولِ حفظِ صحت کے مضامین کی تدریس کی جائے۔ گویا اقبال نے خواتین کو ڈاکٹر، وکیل یا پروفیسر بننے کے لیے تعلیم دینے کی حمایت نہیں کی بل کہ اولاد کی نگہداشت اور پرورش اُنہیں اچھا انسان بننے کی تلقین کی۔ چوں کہ علامہ اقبال مخلوط تعلیم کے خلاف تھے اس لیے اُنہوں نے خواتین کی آزاد یونیورسٹی کی تجویز دی۔ مگر صرف مسلم گریڈ اسکول اور انٹر میڈیٹ کالج کے سوا کوئی اور ادارہ خواتین کی تعلیم بالخصوص فنی یا پیشہ وارانہ تعلیم کا قائم نہ ہو سکا۔ ان تمام حالات کے باوجود برصغیر پاک و ہند میں استعماری نظام کے باوجود تعلیم نسواں کی کوششیں جاری رہیں۔ اس مقصد کے لیے خواتین نے ادب کو بھی ایک ایسا ذریعہ بنایا جو معاشرے کی ذہن سازی میں معاون ثابت ہو۔ برصغیر کے ادبی ورثے میں اُنہوں نے اپنے نظریات کی ترویج کے لیے حتیٰ المقدور کوششیں کیں۔ ایک وقت ایسا تھا جب میر تقی میر نے اپنی شاعری بیٹی کو کبھی منظر عام پر آنے کی اجازت نہ دی حتیٰ کہ اُس کے نام کی بھی پردہ داری کی اور اب برصغیر ایسے تاریخی دور میں داخل ہوا جس میں محمدی بیگم دورِ اول کی ناول نگار اپنے حقوق کی ترجمانی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ نوآبادیاتی عہد جہاں مسلمانوں اور ہندوستانی باشندوں کے لیے غلامی کی اذیت سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد کا نماز ہے وہیں حقوق نسواں اور تعلیم نسواں کے ارتقاء کی بھی تصویر پیش کرتا ہے۔ اسی عہد میں تعلیم، ادب اور سیاست میں بھی خواتین نے اپنا کردار ادا کیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ فاطمہ جناح کا تحریکِ آزادی میں کردار خواتین کی جدوجہد کا آئینہ دار ہے۔

نوآبادیاتی عہد میں خواتین نے مسلسل جدوجہد اور تنگ و دو سے اپنے وجود کو منوانے اور بحیثیتِ انسان تمام شعبہ ہائے زندگی میں بھرپور کردار ادا کیا اور روشن خیال مردوں کی حمایت اور عملی کوششوں سے خواتین کی ہمت افزائی کی گئی۔ چنانچہ نوآبادیاتی عہد کے خاتمے اور آزادی حاصل کرنے تک تمام شعبہ ہائے زندگی میں خواتین اپنا آپ منواتی نظر آتی ہیں۔ اس کے پس پشت لامحدود کاوشیں، قربانیاں جہد مسلسل اور صبر استقلال کار فرما رہا۔

حوالہ جات

- (۱) کلیم احسان بٹ، اقبال کا کلام اور نوآبادیات، مشمولہ پیغام آشنا (اسلام آباد، ثقافتی تونصیلیٹ سفارت اسلامی جمہوریہ ایران، جلد ۱۵، شمارہ ۵، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۵۔
- (۲) روش ندیم، ڈاکٹر، ہندوستان اور یورپ میں نوآبادیات کا تاریخی پس منظر مشمولہ کسار (راول پنڈی، مجلہ گورنمنٹ اصغر مال کالج، ۲۰۱۷ء)، ص ۶۷۔
- (۳) ناصر عباس نیر، مابعد جدیدیت: نظری مباحث (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء) ص ۲۹۷۔
- (۴) میاں ساجد علی، تعلیم نسواں: فکر اقبال اور خیالات اکبر کی روشنی میں، مشمولہ: پیغام آشنا، (اسلام آباد، ثقافتی تونصیلیٹ سفارت اسلامی جمہوریہ ایران، جلد ۱۶، شمارہ ۶۱، ۲۰۱۵ء) ص ۱۳۷۔
- (۵) پروفیسر خورشید احمد، نظام تعلیم (اسلام آباد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ۱۹۹۳ء) ص ۷۰۔
- (۶) الطاف علی بریلوی، سید، ایجوکیشنل کانفرنس کا کردار (کراچی، ایجوکیشنل پریس، ۱۹۸۶ء) ص ۶۷۔
- (۷) سر سید احمد خان، عورتوں کے حقوق مشمولہ مضامین سر سید، علی محمد خان، ڈاکٹر (مرتبہ)، (لاہور، مجلس ترقی ادب، سن) ص ۶۷۔
- (۸) شاہد حسین رزاقی، سر سید اور اصلاح معاشرہ، (لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۳ء) ص ۳۵۵-۳۵۷۔
- (۹) سر سید احمد خان، قومی ہمدردی اور باہمی انفاق مشمولہ مضامین سر سید، محولہ بالا، ص ۱۳۷۔
- (۱۰) سمیع اختر، ڈاکٹر، تعلیم نسواں کا نقیب: حالی، مشمولہ تہذیب اخلاق (حالی نمبر)، (علی گڑھ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۱۴ء) ص ۳۶۔
- (۱۱) راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر، نشاۃ الثانیہ اور علامہ شبلی مشمولہ سہ ماہی اردو ادب، (نئی دہلی، انجمن ترقی اردو، شمارہ ۲، ۱، ۱۹۹۶ء)؛ ص ۶۵۔
- (۱۲) ایضاً، ص ۶۶۔
- (۱۳) انور محمود خالد، ڈاکٹر، تعلیم نسواں مشمولہ: الحمر (لاہور، اکتوبر ۲۰۱۳ء) ص ۹۳۔
- (۱۴) خواجہ محمد زکریا، اکبر الہ آبادی، (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء) ص ۱۳۸۔
- (۱۵) محمد احمد خان، اقبال اور مسئلہ تعلیم (لاہور، اقبال اکیڈمی، ۲۰۲۱ء) ص ۳۳۶۔
- (۱۶) ایضاً، ص ۳۴۷۔